https://telegram.me/ilmokitab

ایک ادھوری ملاقات۔۔۔

پہلی بار جب ان کی آواز میں غالب کے خطوط سنے تو آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ مرزا نوشہ، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ پاس ہی بڑے سے ولایتی شمع دان میں شمع روشن ہے۔ ایک چھوٹی سی تپائی پر بلوری پیالے میں سرخ شراب چمک رہی ہے اور اس سے عرق گلاب کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی ہے۔ ایک دوسرے پیالے میں تلے ہوئے بادام اور نمکین پستے رکھے ہیں۔ مرزا صاحب گھونٹ لیتے ہیں، ایک بادام منہ میں رکھتے ہیں، قلم دان کھول کر کاغذ قلم نکالتے ہیں اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

''آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی! بہت دنوں میں آئے، کہاں تھے؟ آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں؟ میرن صاحب خوش ہیں؟''

آواز بھی ویسی ہی تھی جیسی نجم الدولہ، دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں کی ہونی چاہیے تھی۔ سادہ اور پُرکار، آواز میں نغمے جیسا اُتار چڑھاؤ، لفظوں میں جذبے کی شدت اور ہلکی سی شوخی۔ مراسلہ، مکالمہ بن چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا، ضیا محی الدین غالب کے زمانے میں تو

تھے نہیں جو اُن سے ملتے اور ان کی سنتے۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے مرزا صاحب ان کے منہ سے بول رہے ہوں۔ یہ ایک اداکار کا کمال یا ایک ادب نواز کی عقیدت تو نہیں ہو سکتی کہ وقت پیچھے کو گھوم جائے اور وہ دکھائی دینے لگے جسے گزرے صدیاں بیت چکی ہیں۔ یہ ضرور ایسا معاملہ ہے جس میں آگہی دام شنیدن بچھائے بیٹھی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الیکٹرانک انقلاب آرہا تھا، بازار میں کیسٹ اور CD کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ ہر طرح کی فلمی اور غیر فلمی موسیقی آسانی سے ملنے لگی تھی، مرزا غالب کا کلام بھی کہیں کہیں سنائی دیتا تھا مگر ان کے خطوط، ان کا ''عود ہندی'' کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں جب ضیا محی الدین کی آواز گونجی تو خوش ذوق حضرات چونک پڑے!

پھر اس کے بعد اسمارٹ فون آیا اور اس کے ساتھ Youtube بھی آیا، ہم جیسوں کی تو عید ہوگئی۔ شام ڈھلی، رات کا جادو پھیلا اور میں نے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر ضیا محی الدین کو نکال لیا، رات کی تنہائی میں اور کوئی نہ ہوتا بس وہ ہوتے، میں ہوتا اور ادب عالیہ کی پھوار دھیرے دھیرے روح کو تر اور معطّر کرتی رہتی۔ ضیا صاحب کو سننے میں کئی فائدے تھے، ایک تو یہ تھا کہ ادبی شہ پاروں کو کھوجنا نہیں پڑتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کا انتخاب، چاہے وہ کہانی ہو، طنز و مزاح ہو یا نظم و غزل ہو، بہت عمدہ ہوتا تھا۔ تیسرا فائدہ یہ تھا کہ آنکھوں پر زور نہیں ڈالنا پڑتا تھا جو تیزی سے کم زور ہوتی جارہی ہیں۔ میرے سننے اور ان کے سنانے کا سلسلہ جب سے شروع ہوا، ایک آرزو بھی کسی خوشبودار پھول کی بیل کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ کبھی وہ بیل پھولوں سے بھر جاتی اور کبھی سوکھنے لگتی مگر میں نے اسے مرنے نہیں دیا۔ وہ آرزو تھی کہ ضیا محی الدین اپنی کسی پڑھنت میں میرا نام بھی لیں۔ وہ کبھی میرے کسی خاکے یا کہانی کو اپنے جادو سے زندہ کردیں مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ ویسے پاکستان ہم ہندوستانیوں کے لیے دوسری دنیا ہی ہے، جس تک پہنچنا آسان نہیں۔ مگر ضیا صاحب تک رسائی حاصل کرنا تو جوئے شیر معلوم ہونے لگا تھا۔ میرے

پاس ان کا فون نمبر بھی نہیں تھا اور اطلاع یہ تھی کہ وہ کسی ایرے غیرے سے نہ ملتے ہیں اور نہ فون پر بات کرتے ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بالکل ہی ناواقف ہوں، کیوں کہ پاکستان کی ''نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس'' کے زیرِ اہتمام، جس کے وہ سربراہ تھے، میرے کئی ڈرامے اسٹیج کرا چکے تھے، جن میں ''بیگم جان'' اور ''سال گرہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ اِن دونوں ڈراموں کے بہت سے شوز کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی کیے گئے تھے اور سب ضیا صاحب کی نگرانی میں ہوئے تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ اُن تک پہنچوں کیسے؟ اس لیے سوچتا تھا اور اُداس ہو جاتا تھا۔

سنا ہے کہ لگن سچّی ہو تو بند دروازہ کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، میری کتاب ''مٹھی بھر کہانیاں'' ہندوستان میں شائع ہوئی تو میری محترم بہن، مشہور شاعر اور ادیب، ڈاکٹر فاطمہ حسن نے خواہش ظاہر کی کہ وہ کتاب آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام، پاکستان میں بھی شائع ہو اور اس کے لیے آرٹس کونسل کے روحِ رواں محترم احمد شاہ صاحب سے اجازت بھی لے لی۔ مجھ سے کہا گیا:

''آپ بس مسوّدہ بھیج دیجیے، باقی ہم سنبھال لیں گے!''

اور وہی ہوا۔ پاکستان میں ''مٹھی بھر کہانیاں'' شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس دوران میں، مَیں نے فاطمہ بہن سے درخواست کی:

''کیا کسی صورت سے میری کتاب ضیا محی الدین تک بھی پہنچ سکتی ہے؟''

انھوں نے فرمایا:

''ناپا (نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس) آرٹس کونسل کے سامنے ہی ہے، میں اکثر جاتی رہتی ہوں۔ کتاب خود ہی پہنچا دوں گی!''

میں نے عرض کیا:

''اگر ممکن ہو تو میری خاکوں والی کتابیں یعنی 'روشن دان' اور 'لنگر خانہ' بھی پہنچا دیجیے!''

کچھ دن بعد پتا چلا کہ ''روشن دان'' تو نہیں ملی لیکن ''لنگر خانہ'' اور ''مٹھی بھر کہانیاں'' ضیا صاحب تک پہنچ چکی ہیں۔ میں اُس رات سو نہیں سکا اور تصوّر کرتا رہا کہ ضیا صاحب میری کتاب پڑھ رہے ہیں اور بار بار اپنے مخصوص انداز میں سر کو جھٹکتے بھی جا رہے ہیں۔ اور میں دم بخود اُن کے منہ سے نکلنے والے کسی لفظ کا منتظر ہوں!

کبھی کبھی ایک لفظ، ایک آواز، ایک اشارہ کتنا اہم ہو جاتا ہے، اُس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں انتظار کا عذاب جھیلنا پڑا ہو۔ ضیا محی الدین کے جواب کا انتظار مجھے اس لیے نہیں تھا کہ اگر انھیں میرا کوئی خاکہ یا کہانی پسند آئے گی تو وہ اپنی پڑھنت میں شامل کریں گے اور وہ بات، جو ابھی کچھ لوگوں تک پہنچی ہے، لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔ میری بے چینی کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ میں ضیا صاحب کے ذوق انتخاب کا مداح تھا۔ وہ ایسے ایسے نگینے چن کر لاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی اور ایسی ایسی جگہوں سے لاتے تھے جہاں عام آدمی کے تصور کی رسائی تک نہیں ہوتی، اگر انھیں میری تحریر پسند آئے اور وہ تعریف کریں تو وہ تعریف ایک دوست، ایک قاری یا ایک نقاد کی نہیں ہوگی بلکہ ادب کے ایک ایسے پارکھی کی ہوگی جو سارا کتب خانہ چھان کر ادب کا ایک موتی اٹھا لیتا ہے اور جب وہ اُسے جھاڑ پونچھ کر، پالش کر کے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو آنکھیں خیرہ اور کان حیران ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ دس دن تک تو کوئی رسید بھی نہیں ملی۔ میں نے سوچا، ناپا کی مصروفیات اور اسٹیج کے پروگراموں سے فرصت ہی نہیں ملی ہوگی کہ میری کتابیں کھول کر دیکھتے۔ کچھ دن اور گزر گئے تو دل نے کہا، تو اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے بھائی! ایسے کون سے سُرخاب کے پر لگے تھے تیری کتابوں میں کہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ وہاں تو درجنوں کتابیں روزانہ آتی ہوں گی اور میز کے کسی کونے پر یا الماری کے کسی گوشے میں رکھ دی جاتی ہوں گی۔ ایسے ہی کسی انبار میں ''لنگر خانہ'' اور ''مٹھی بھر کہانیاں'' بھی دبی پڑی ہوں گی۔ لیکن اچانک ایک دن اُن کا ای میل آیا، بالکل ایسا لگا جیسے گھنے بادلوں کے بیچ سے سورج نے جھانک لیا ہو، تاریخ

تھی 24 اکتوبر 2022۔ انھوں نے لکھا تھا:

''جاوید صدیقی صاحب کو سلام پہنچے،

آپ نے بہت کرم کیا کہ مجھے اپنی دو کتابیں بھیجیں،

'بیکس صاحب' اور 'بی حضور' ایسے مضامین ہیں جو میری نظر میں اُردو کا بہترین ادب (اگر کوئی اس قسم کی کتاب ہے) میں شامل ہونا چاہیے۔ 'بیکس صاحب' والا خاکہ پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور ابھی تک نم ہیں اور 'بی حضور' پڑھ کر تو گھِگّی بندھ گئی۔

آپ کی زبان، آپ کا لہجہ، آپ کی حسِ ظرافت اور سب سے بڑھ کر ایسی ایسی تفصیلات کا اس عمدگی سے اپنے 'خاکے' میں سمو دینا کہ ہمیں متن سے distract نہ کریں، بہت مشکل کام ہے۔ مگر آپ اس میں سرخرو نکلے۔ باقی مضامین سینت سینت کے پڑھوں گا۔

بے حد شکریہ کے ساتھ

ضیا محی الدین''

✿✿✿

اُن کا میل ہی ایک وار میں ڈھیر کر دینے والا تھا، اُس پر طرّہ یہ کہ عام ای میل جیسا ٹائپ کیا ہوا نہیں تھا بلکہ ان کے اپنے قلم کی تحریر تھی جس کی فوٹو کاپی بھیجی گئی تھی، صاف، شفاف، پختہ تحریر جو کسی حد تک خطِ نسخ معلوم ہوتی تھی۔ میرے لیے ان کے الفاظ اگر سونا تھے تو رسم الخط سونے پر سہاگا تھا۔ دیر تک خوش ہونے، چپکے چپکے مسکرانے اور بار بار پڑھ کے مزہ لینے کے بعد میں نے قلم سنبھالا اور لکھا:

26/Oct/2022”

میرے محترم، آداب!

آپ کی تعریف میرے لیے کسی پدم شری اور تمغۂ امتیاز سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ میری زبان کے محسن ہیں، آپ نے اردو کو ان لوگوں تک پہنچایا ہے جو اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ مگر اب آپ کے کرم سے سنتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔

میں نے بہن فاطمہ حسن سے درخواست کی ہے کہ وہ میرے خاکوں کی پہلی کتاب ’روشن دان‘ بھی آپ تک پہنچا دیں۔ یقین ہے کہ کل پرسوں تک آپ کو پہنچ جائے گی۔

بڑا ارمان ہے کہ زندگی اور وقت اجازت دے دیں تو قدم بوسی کا شرف حاصل کروں!

نیاز مند

جاوید“

✿✿✿

ایک زمانہ تھا کہ محبوب کو مکتوب پہنچانے کے لیے قاصد کی ضرورت ہوتی تھی، قاصد اگر بھلا آدمی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ کبھی کبھی خط کے ساتھ ہی غائب ہو جانے کا ڈر بھی رہتا تھا۔ غالب بے چارے تو اتنے تنگ تھے کہ انھوں نے کہا:

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

خطوں میں دیر سویر تو محکمہ ڈاک وتار کے بہترین انتظام کے باوجود اب بھی ہوتی ہے مگر شکر کیجیے ٹیکنولوجی کی ترقی اور نئی نئی ایجادات کا کہ جب سے ای میل کا سلسلہ شروع ہوا ہے پلک جھپکنے میں دیر ہو سکتی ہے مگر مکتوب پہنچنے میں نہیں ہوتی۔ مجھے میل بھیجے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ ضیا صاحب کا جواب آیا:

26/Oct/2022”

چٹخارے دار اُردو کے معمارِ اعظم!

ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ یہاں کی اُردو کانفرنس میں آپ بھی آ رہے ہیں، میں ابھی سے آپ کو 'بُک' کرنا چاہتا ہوں کہ ایک رات میرے گھر دال روٹی کھایئے، ابنِ انشا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اُن کے ایک کرم فرما ہمیشہ اصرار کرتے تھے کہ میرے ساتھ دال روٹی کھایئے۔ وہ اپنے قول کے ایسے پکّے تھے کہ دال روٹی ہی کھلاتے تھے۔ میں ان کے کرم فرما کی تقلید نہیں کروں گا، کھانا میں بھی دیر سے کھاتا ہوں اس لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔

آپ کی بعض تحریریں پڑھ کر وہ مزہ ملتا ہے جو مناسب آنچ پر بھُنے ہوئے بھٹے پر ذرا سا نمک مرچ اور لیموں کے چند قطروں کا چھڑکاؤ سمیت کھانے میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن نے یہ بھی بتایا کہ 'روشن دان' جیسے ہی انھیں ملے گی وہ مجھ تک پہنچا دیں گی، ابھی سے بتا

پیار

ضیا محی الدین“

✿✿✿

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں اتنی تعریفوں کی توقع نہیں کر رہا تھا مگر اُمید سے زیادہ جو کچھ بھی ملتا ہے اُس کی خوشی بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے میں نے لکھا:

28/Oct/2022”

میرے محترم، آداب!

حیران ہوں کہ آپ کی محبت اور شفقت کا اعتراف کن لفظوں میں کروں کیوں کہ آپ

کی عنایت بہت بڑی ہے اور شکر یہ کا لفظ بہت چھوٹا!

آپ نے مجھے 'چٹخارے دار اردو کا معمار اعظم' لکھا ہے۔ یہ سراسر ظلم ہے کیوں کہ اپنے بارے میں ایسی باتیں سن کر بہت دن تک آئینے کے سامنے سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا، اور کام کاج کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ ہم کیا کھا کے چٹخارے دار زبان لکھیں گے، یہ کمال تو مشتاق احمد یوسفی اور پطرس بخاری اپنے ساتھ لے گئے، بھولے بھٹکے کوئی اچھا جملہ قلم سے نکل جاتا ہے تو احتیاطاً چاروں طرف دیکھ لیتا ہوں کہ کہیں چوری کا الزام نہ لگ جائے!

آپ تک پہنچنے کی کوشش پچھلے کئی سال سے کر رہا تھا، میری کتابوں کے بہت سے ایڈیشن پاکستان میں شائع بھی ہوئے مگر کسی اللہ کے بندے کو توفیق نہ ہوئی کہ آپ تک وہ کتابیں پہنچا سکے۔ خدا بھلا کرے فاطمہ حسن کا کہ انھوں نے مہربانی کی اور میری حقیر کوشش کو آپ تک پہنچا دیا۔ مجھے اُمید ہے کہ خاکوں کی پہلی کتاب 'روشن دان' بھی آپ تک پہنچ گئی ہوگی یا پہنچنے والی ہوگی۔ خدا کرے کہ اس میں سے بھی کوئی چیز ایسی نکل آئے جو آپ کی پسند پر پوری اُترے!

آپ کی شفقت ہی کیا کم تھی کہ ایک شام ساتھ گزارنے کی دعوت بھی مل گئی ہے۔ 'دال روٹی' کی خوش خبری تو سونے پر سہاگا ہے۔ میں ابھی سے نمک خواری کے لیے تیار ہوں۔

نیازمند

جاوید"

✿✿✿

ضیا محی الدین صاحب کی عنایت دیکھیے کہ اپنی طرح طرح کی مصروفیات کے باوجود فوراً جواب دیا۔ انھوں نے لکھا:

31/October/2022"

حضرت! آپ کی مٹھی بھر کہانیوں میں ایسی ایسی جزیات ہیں کہ ان کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ 'کیسریا بالم' مجھے بہت پسند آئی، آپ کا مشاہدہ بہت باریک ہے۔ 'مانڈ راگ' میرا بھی مرغوب راگ ہے، لتا منگیشکر نے اِسی بندش کو ساڑھے تین چار منٹ میں کسی فلم میں گایا ہے جو میں کئی بار سن چکا ہوں۔ مگر یہ کہانی اور افسانہ نہیں یہ تو ایک ناولٹ ہے بلکہ یہ آپ کی آپ بیتی کا ایک باب ہے جو آپ کی آپ بیتی میں بھی ہونا چاہیے۔ آپ اپنی آپ بیتی لکھ چکے ہوں گے، اگر نہیں تو خدارا ضرور لکھیں۔ رشتے ناتوں کو آپ اس طرح گوندھتے ہیں جیسے اکبری بوا پھلکیاں بناتی ہیں۔

آپ کا کھیل 'بیگم جان' میں نے یہاں NAPA میں پیش کیا تھا جس کی بہت پذیرائی ہوئی، میری اس پروڈکشن کو لاہور میں بھی دکھایا گیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ دو چار ایسے کھیل لا سکیں جو ہم یہاں اسٹیج کریں؟ 'امن کی آشا' کے دنوں میں مجھے ہندوستان آنے کا اتفاق ہوا تھا، آپ کی 'تمہاری امرتا' دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس میں فاروق شیخ کا کام بہت عمدہ تھا لیکن شبانہ اعظمی کا کام دیکھ کر اُداسی ہوئی۔ ایسی تجربہ کار ایکٹریس 'اردو گھرانے کی لڑکی' اور ایسا مایوس کن Diction۔

ہو رہا ہے ختم اب اُردو زباں کا بانکپن،
وزن کو اب تو پڑھے لکھے بھی کہتے ہیں وَزَن
نرم کو کہہ کر نَرَم اور گرم کو کہہ کر گَرَم

پیار
ضیا محی الدین"

✿✿✿

میں نے جواب دیا۔۔۔

05/Nov/2022"

میرے محترم، آداب!

آپ کی شفقت اور محبت سے لبریز جو ای میل ملا تھا اس کے جواب میں تاخیر ہوگئی۔ معافی چاہتا ہوں۔ وجہ اس گستاخی کی میری آنکھوں کا پریشر ہے، جو بڑھ جاتا ہے تو دنیا اندھیر ہوجاتی ہے۔

آپ نے فرمایا ہے کہ میں اپنی سوانح لکھوں تو عرض یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی کی داستان حیات کس کی دلچسپی کا باعث ہوگی، سارے عام آدمیوں کی کہانیاں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جو قابل ذکر واقعات تھے وہ خاکوں کی شکل میں لکھ چکا ہوں۔ جنھیں ایک خاص ترتیب میں پڑھا جائے تو میری تصویر بھی بن جاتی ہے۔ دیگر غیر اہم تفصیلات Website پر موجود ہیں!

امید ہے کہ 'روشن دان' آپ تک پہنچ چکی ہوگی، اگر وقت ملے تو ایک نظر ڈال لیجئے گا۔ کتاب کی عاقبت سنور جائے گی۔ آپ کی Audio book کا Link مل جاتا تو بڑی نوازش ہوتی!

خدا آپ کو ہمیشہ خوش اور تندرست رکھے، آمین۔

نیازمند

جاوید"

❁❁❁

ضیا صاحب نے اپنے ای میل میں لکھا۔

07/Nov/2022"

عزیزمن!

'روشن دان' مل گئی۔ میں جو کچھ آپ کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا وہ انجینئر راشد اشرف صاحب نے مجھ سے بہتر 'ادھر بھی دیکھ' لکھ کر بیان کر دیا ہے۔ ابھی تک صرف ان کا پیش لفظ پڑھا ہے، شاید میں نے پہلے ذکر کیا تھا۔ بڑھیا کتابوں کو میں سینت سینت کر پڑھتا ہوں، اس خوف سے کہ یہ تو جلدی ختم ہو جائے گی۔

حضرت! عجز و انکساری آپ کا چولا نہیں، آپ کی تہذیب ہے، آپ کی زبان میں وہ چاشنی ہے جو پرت در پرت پراٹھے میں، جس کے اوپر گھی نظر نہیں آتا، لیکن جب نوالہ منہ میں رکھیں تو رِندھے ہوئے اصلی گھی کا مزہ ملتا ہے۔ آپ کی نثر اس سے بھی زیادہ مزے دار ہے۔

'کوثر میں دھلی ہوئی زبان' تو اب ایک 'سیسہ پلائی دیوار' کی طرح 'Cliche' بن گیا ہے جسے نقاد بڑی فیاضی سے مصنفوں کو بانٹتے ہیں۔ آپ کی زبان پڑھے لکھے اردو گھرانوں کی بولی ہے۔ آپ کی خواتین کی زبان میں محاورے اُنھیں جگہوں پر آتے ہیں جہاں اُنھیں آنا چاہیے، مولوی نذیر احمد کی طرح نہیں۔ متوسّط طبقے ہی نہیں، نچلے متوسّط طبقے، اور آپا ئیں ہوں یا خالائیں، انائیں ہوں یا ماما ئیں، خادمائیں یا مہترانیاں، آپ ان کا لہجہ بھی ایسی مہارت سے پکڑتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کو سنتے چلے جائیں۔

یوسفی صاحب کی زبان علمیت میں لپٹی ہوئی زبان ہے۔ کہیں کہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ زبان 'محنت' میں ڈھل کر نکلی ہے۔ میں ان کی برائی نہیں کر رہا، میں یوسفی صاحب کا مداح ہوں اور ہمیشہ اپنی پڑھنت میں ان کو شامل کرتا ہوں۔ ان کا بھولپن بھی مجھے پسند ہے۔ کبھی کبھی ان کی 'معصومیت' سے جو PunchLine نکلتی ہے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر پھیلا دیتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ پیراگراف تیسرے یا چوتھے ڈرافٹ کے بعد لکھا گیا ہے۔

پطرس نے اردو میں Sophisticated لکھا ہے۔(مجھے اس لفظ کا صحیح متبادل آج تک نہیں ملا۔شستہ،شائستہ،شگفتہ میں وہ بات نہیں) اُن کی زبان میں بے ساختگی ہے۔ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کا راوی دوسروں کی کم زوریوں اور کمینگیوں کا پول تو کھول دیتا ہے لیکن ایسے کہ خود 'راوی' کی خباثتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مجھے ان کی Understatement بہت پسند ہے،اور یہ چیز ان کی گھٹی میں انگریزی ظرافت نے ڈالی۔ان کی پتلی سی کتاب 'پطرس کے مضامین' سیکڑوں مزاح کی کتابوں پر بھاری ہے۔ مضمون لمبا ہو گیا بس ایک چھوٹا سا سوال ہے۔

آپ نے ایک جگہ لکھا ہے،'سوتے ہوتے ہیں' اور ایک جگہ شاید 'جاگتے ہوتے' یہ تو خالص پنجابی کا اردو ترجمہ ہے۔کیا ایسا بولا جاتا ہے؟ میں نے تو ایک شاگرد کو، جو یہ کہہ رہا تھا کہ 'جب ہم کام کرتے ہوتے ہیں' کہا کہ اردو میں ہم ایسا نہیں کہیں گے۔ہم کہیں گے 'جب ہم کام کر رہے ہوتے ہیں' لیکن اگر 'کام کرتے ہوتے' ایسا بولا جاتا ہے تو میں شرمندہ ہوں

شکریہ کے ساتھ

ضیا محی الدین''

✿✿✿

08/Nov/2022''

میرے محترم،آداب!

'پرت در پرت پراٹھے' کی بھی خوب رہی!

عالم پناہ! آپ نے غضب ڈھایا ہے کہ ہم اردو والوں کو اپنی نثر سے محروم رکھا ہے، آپ کے جملوں میں جو بے ساختگی اور تیکھا پن ہوتا ہے، انھیں پڑھ کر خواہش ہوتی ہے کہ

بات جلدی سے ختم نہ ہو جائے بلکہ کسی دل نواز راگنی کی طرح گونجتی رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے مضامین لکھے ہوں اور میری نظر سے نہ گزرے ہوں کیوں کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جو شخص دوسروں کے چراغوں سے اُجالا پھیلا رہا ہو اس کی اپنی روشنی نہ ہو۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ کی تحریروں تک میری رسائی ہو سکے گی؟

آپ نے 'کام کرتے ہوتے اور کر رہے ہوتے' پر توجہ دلائی ہے جس پر میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے دونوں طرح سنا ہے، اگر 'کرتے ہوتے' غلط ہے تو آئندہ خیال رکھوں گا۔ ویسے بھی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں، 'زبان جن کے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔' میں تو خادم ہوں اور خادموں سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔

پطرس اور یوسفی صاحب کے بارے میں آپ کی رائے سر آنکھوں پر لیکن یوسفی صاحب کی دو آتشہ بلکہ چہار آتشہ تحریر اس لیے زیادہ مزہ دیتی ہے کہ اس میں علمیت کا قوام لگا ہوتا ہے، جو دھیرے دھیرے زبان پر گھلتا ہے۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کا مزاح اس لیے اچھا لگتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک جملے بلکہ کبھی کبھی تو ایک لفظ میں پورا منظر بدل دیتے ہیں، اور یہ کمال کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ کتابیں 'سینت سینت' کر پڑھتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی عادت ہے مگر میں نے اس کا توڑ یوں ڈھونڈا ہے کہ کوئی اچھی کتاب مل جائے تو اُسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہوں اور جب ختم ہو جاتی ہے تو دوبارہ پڑھنا شروع کرتا ہوں اور ایک ایک لفظ کا مزہ لیتا ہوں۔ کچھ کتابیں تو ایسی ہیں کہ جی ہی نہیں بھرتا 'روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے پھر وہیں لوٹ کے آ جاتا ہوں!'

آپ کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا گو

نیاز مند

جاوید"

08/Nov/2022"

آپ کی کتابوں میں ایسا محو ہو گیا ہوں، 'چند باتیں' کی بجائے 'ادھر بھی دیکھ'، لکھ گیا۔

معذرت!

ضیا محی الدین"

✿✿✿

15/Nov/2022"

خاکوں کے معجز بیاں!

آپ نے میری نثر کی تعریف کی، میرے منہ سے نکلا 'اے لیو' (عطیہ حبیب اللہ جب بھی کوئی ایسی بات کرنا چاہتیں جس پر انھیں سخت حیرت ہو تو وہ فقرہ شروع کرنے سے پہلے ''اے لیو'' کہتی تھیں۔)

اتنا بڑا اعزاز مجھ پہ کسی طرح نہیں پھبتا، نثر تو وہ ہوتی ہے جیسی داؤد رہبر صاحب لکھتے تھے۔ غالب کے خطوط کی بے مثال نثر کے بعد اپنے خطوط میں جیسی نثر انھوں نے لکھی وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں آپ کو ان کی کتاب 'سلام و پیام' جو ان کے خطوط کا مجموعہ ہے، پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں۔ ظرافت اور علمیت میں چھپی ہوئی 'گفتگو' کی نثر۔

جب میں تیرہویں سے چودہویں جماعت میں پہنچا تو میں نے ایک افسانہ لکھا، جو مولانا صلاح الدین احمد کے پرچے 'ادبی دنیا' میں چھپ گیا، اُس دن تو میں نویں بادل پہ تھا۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ داؤد رہبر صاحب کی سفارش سے چھپ گیا ہوگا کیوں کہ وہ خاصا پھسپھسا افسانہ تھا۔ پھر جب ریڈیو پاکستان میں مجھے نوکری ملی اور میں کراچی آ گیا تو یہاں صہبا لکھنوی صاحب کے پرچے 'افکار' میں میری کچھ کہانیاں چھپیں، جن میں ایک کہانی 'ماری پور کی بتیاں' میں مَیں نے قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں لکھے، ان کے

رہن سہن کے طریقے کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا تھا، اس پر وہ بہت خفا ہوئی تھیں اور ہماری دوستی میں دراڑ آ گئی تھی لیکن بعد میں پھر دوستی ہو گئی۔

آٹھ نو سال ہوئے میرے ایک دو مضامین آصف فرخی مرحوم نے اپنے رسالے 'دنیازاد' میں چھاپے تھے۔ ایک 'خاکہ' جس کی نثر پہ میں شرمندہ نہیں ہوں، وہ داؤد رہبر صاحب کے بارے میں لکھا تھا اور وہ 'دنیازاد' میں چھپا تھا۔ آپ کہیں تو آپ کو بھجوا دوں؟ کیا آپ کو میرا انگریزی کا وہ مضمون (جو میری کتاب کے باب کا حصّہ تھا) ملا تھا؟

پیار

ضیامحی الدین"

✿✿✿

21/Nov/2022"

میرے محترم، آداب!

بے حد نوازش اور عنایت کہ آپ نے اپنی کتاب کا Link بھیجنے کا وعدہ کیا۔ عمران صاحب نے ابھی تک بھیجا نہیں ہے مگر یقین ہے کہ ایک دو دن میں مل جائے گا۔

میں داؤد رہبر صاحب سے واقف نہیں تھا لیکن آپ کی زبان سے اُن کے خطوط سن کر اور خاص طور سے 'ابا جان' والا خاکہ سننے کے بعد ماننا ہی پڑا کہ سچ مچ ایسی شائستہ اور دلچسپ نثر ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کوشش کروں گا کہ 'سلام و پیام' کہیں سے ہاتھ آ جائے تاکہ اُن کی تحریر کا پورا مزہ لے سکوں۔ کبھی کبھی حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی کہ ہماری زبان نے کیسے کیسے صاحب طرز ادیب پیدا کیے جو اپنے حالات یا ادبی گروہ بندی کا شکار ہو گئے اور انھیں وہ مقام نہیں مل سکا جو ملنا چاہیے تھا۔ آپ نے داؤد رہبر صاحب کا جو خاکہ لکھا تھا اور جو آصف فرخی کے پرچے میں شائع ہوا تھا، پڑھنے کو مل جائے تو اُس تلاش کی

بڑی حد تک تسکین ہو جائے گی جو آپ کی پڑھنت نے پیدا کر دی ہے۔

حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں اپنے ڈرامے آپ کو ارسال کروں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ 'تمہاری امرتا، بیگم جان، آپ کی سونیا اور سال گرہ' آپ کے شہر میں اسٹیج ہو چکے ہیں۔ کیا آپ کو اِن ڈراموں کے اسکرپٹ درکار ہیں یا پھر دیگر ناٹک، جو ابھی تک پاکستان نہیں پہنچ پائے ہیں؟ یہاں میں آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا کہ میری کتاب 'مٹھی بھر کہانیاں' میں تین کہانیاں ایسی ہیں جنھیں یہاں اسٹیج کیا جا چکا ہے اور ان کے بہت سے شوز ہو چکے ہیں۔ یہ کہانیاں ہیں، 'ماٹی کہے کمہار سے، گڑ مبا (One Woman Show) اور موگرا' (One Man Show) ان کے علاوہ بھی کوئی درجن بھر ناٹک اور ہیں جن کے شوز ہوتے رہتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے تو میں ان سب کے تعارفی نوٹ آپ کو روانہ کر دوں گا۔

اُمید ہے کہ آپ خاکوں کی دونوں کتابیں پڑھ چکے ہوں گے۔ کافی خاکے ایسے بھی ہیں جو اُن دو کتابوں میں شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ ان میں سے ایک خاکہ، جو نسبتاً نیا ہے، اقبال نظر کے رسالے 'کولاژ' میں شائع ہوا ہے۔ یہ خاکہ جس کا عنوان 'صاحب' ہے، دلیپ کمار صاحب کے بارے میں ہے۔ اقبال نظر صاحب نے اپنا پرچہ آپ تک پہنچا دیا ہوگا، اگر وقت ملے تو اُس پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے گا!

خدا آپ کو سلامت اور صحت مند رکھے، آمین۔

نیاز مند

جاوید"

✿✿✿

اُسی دن ضیا صاحب کا میل آیا جو شاید میرا مراسلہ پہنچنے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

21/Nov/2022"

محبی!

دونوں کتابیں پڑھنے کے بعد تب وتاب سمجھ میں آئی کہ جنھیں آپ خاکے کہتے ہیں، یہ آپ کی آپ بیتی ہی تو ہے۔ آپ کا بچپن، لڑکپن، آپ کی جوانی، آپ کی شدید عُسرت کا زمانہ، آپ کی اَن تھک محنت اور سب سے بڑھ کر آپ کا والہانہ عجز، سب کچھ دل کو مسوس کر رکھ دیتا ہے۔

جن جن فلموں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان میں سے سوائے 'شطرنج کے کھلاڑی' کے ایک بھی کھیل (فلم کہنا چاہیے تھا) مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا کیوں کہ اکاون سے 1976 کا زمانہ ملک سے باہر گزرا۔ ستیہ جیت رے کو میں عظیم ڈائرکٹروں میں شمار کرتا ہوں مگر سنجیو کمار صاحب کا کام دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ (میری نظر میں) کسی طرح اپنے لب ولہجہ سے یہ تاثر پیدا نہیں کر سکے کہ وہ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ کے اُمرا کی پیداوار ہیں۔

میں نے تین کتابیں لکھی ہیں، تینوں انگریزی میں ہیں۔ آپ سے ملاقات ہوگی تو آپ کو پیش کروں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ کیوں انگریزی میں لکھی ہیں۔ سوانح عمری ان لوگوں کی لکھنی چاہیے جو۔۔۔ (لفظ پڑھا نہ جاسکا)

(یہ میری اصطلاح ہے گنے چنے لوگوں کے لیے، جو نوادراتِ زمانہ ہیں اور ایسے لوگوں کی خدمت میں میرا نمبر ایک لاکھ تہتر ہزار سات سو چھیاسی والا ہے۔)

کیا آپ کے ڈراموں کا مجموعہ یا مجموعات چھپے ہیں؟ میں نے یہاں آپ کے دو ڈرامے 'بیگم جان' اور 'سال گرہ' اسٹیج کیے ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کے ایک دو اور ڈرامے بھی اسٹیج کراؤں۔

پیار

ضیا محی الدین"

23/Nov/2022"

عزیزم!

عمران صاحب کی طرف سے جو ای میل مجھے آیا تھا وہ کل میں نے آپ کو بھیج دیا تھا۔ وہ آپ کو Complimentary Link بھیجیں گے۔ ذرا سست ہیں، اگر دو چار دنوں میں انھوں نے آپ کو Link نہ بھیجا تو مجھے بتائیے گا، میں ان کو پھر یاد دہانی کرا دوں گا۔

میں نے اس Audio کتاب میں غلام عباس کی 'آنندی'، عصمت چغتائی کا 'چوتھی کا جوڑا' اور 'ننھی کی نانی'، پریم چند کا افسانہ 'کفن'، منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، اسد محمد خان کا 'باسودے کی مریم' اور پطرس کا 'مرحوم کی یاد میں' وغیرہ پڑھی تھیں۔

خاکوں کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد ہی کل میں نے ایک ای میل آپ کو بھیجا تھا۔ سلام و پیام کی کتاب مجھے یہاں مل گئی ہے، وہ آپ کی نذر کروں گا، جب آپ یہاں آئیں گے اور اپنی تین کتابیں بھی۔

اقبال نظر صاحب نے اب تک کوئی پرچہ مجھے نہیں بھیجا۔ دلیپ کمار صاحب نے، جب میں 1970 میں بمبئی (اس زمانے میں بمبئی نام تھا، اکثر لوگ اسے بمبے بولتے تھے) James Ivory کی فلم 'Bombay Talkies' میں کام کرنے آیا تھا اور پانچ مہینے بمبئی میں ٹھہرا تھا۔ ایک شام انھوں نے مجھے کھانے پہ بلایا تھا، جس میں صرف سلکشنا پنڈت موجود تھیں، جنھوں نے محمد رفیع کا گانا 'من رے تو کاہے نا دھیر دھرے' سنایا۔ کیا خوش شکل لڑکی تھی۔ کیا عمدہ ناک نقشہ تھا۔ گانا بھی اس نے (بغیر طبلے کی سنگت کے) ایسے اچھے سُر میں سنایا تھا کہ میں محمد رفیع کی گائیکی کا قائل ہو گیا۔ میں محمد رفیع کو 'سر پہ ٹوپی لال، ہاتھ میں ریشم کا رومال' قسم کے گانے والوں میں سمجھا کرتا تھا۔ دیکھیے آپ کیسی کیسی باتیں یاد دلاتے ہیں۔

میرا مطلب ڈراموں سے ہے، ناٹک کہہ لیجیے۔ 'بیگم جان' کی طرح آپ کے دو ایک کھیل ایسے ضرور ہوں گے جس کا انجام یا جن میں 'سرخ سویرا' کی خواہش نہ ہو۔ اگر 'سالگرہ' کی طرح دو کھیل ہوں، ایک ایک ایکٹ کے، جنھیں Double Bill کے طور پر

پوری شام (یعنی تقریباً دو گھنٹہ کی مدت) کھیلا جا سکے۔ مجھے One Man Show بھی اور One Woman Show والے کھیلوں کا مسوّدہ بھی، ممکن ہو تو بھیج دیجئے، بہت عنایت ہوگی۔ آپ اگر اپنے ساتھ لے آئیں تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ بہت دن پہلے جو انگریزی کے مضمون کا ایک باب آپ کو بھیجا تھا (کچھ اپنی اردو سیکھنے کے بارے میں) وہ آپ کو ملا یا نہیں؟

پیار
ضیامحی الدین"

✿✿✿

23/Nov/2022"

میرے محترم، آداب!

گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ آپ نے بہت ظلم کیا ہے، خود پر بھی اور ان پر بھی، جو اچھی تحریر کے لیے ترستے ہیں۔ حیرت ہے کہ داؤد رہبر پر اتنا اچھا خاکہ لکھنے کے بعد بھی لوگوں اور خاص طور سے آصف فرخی نے آپ کو گھیر کر مزید خاکے نہیں لکھوائے۔ زیرِ نظر 'کبیرے کا پنچھی' میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے خاکے کا خاصہ ہیں۔ اس میں ایک مکمل شخصیت ہے، ایک ماحول ہے، شوخی ہے، ظرافت ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک عہد ہے، جو سانس لیتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ وہ شخصی خاکے، جن میں لکھنے والا خود موجود نہ ہو، سنی سنائی حکایت معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے خاکے میں آپ کی اپنی موجودگی اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی صاحب خاکہ کی۔ اس مضمون سے کچھ اور پردے بھی اٹھتے ہیں جن میں سب سے اہم موسیقی سے آپ کی دلچسپی اور طبلہ نوازی ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ قصے، جن کو ہم خاکہ بول کر آگے بڑھ جاتے ہیں، زندگی کے سفرنامے ہیں، جن میں سفر بھی ہے، مسافر بھی اور ایک ہم سفر بھی، جو داستان گو کا کردار ادا کرتا ہے۔ آپ کی زندگی کا سفر طویل بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی زندگی میں ایسے درجنوں افراد آئے ہوں گے جن کی یادیں، جن کی باتیں اور جن کی صورتیں گھنے جنگل میں جلتے چراغ کی طرح اچانک سامنے آجاتی ہوں گی۔ کیا وہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ آپ ان کو یاد کریں اور ہم جیسے نیازمندوں کو بھی ان یادوں میں شامل کرلیں؟

پس نوشت: اگر پرانا زمانہ ہوتا تو یوں لکھتا کہ ابھی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ آپ کا تازہ مراسلہ پہنچ گیا (Mail کے لیے مراسلہ کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے)۔ آپ نے عمران صاحب کو بتادیا کہ مجھے Link بھیجنا ہے، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے، وہ جب چاہیں بھیج دیں۔ آپ نے اپنی کتاب کی جن کہانیوں کا ذکر کیا ہے وہ سب بار بار کی پڑھی ہوئی ہیں، مجھے تو وہ ذائقہ چاہیے جو آپ کی پڑھنت میں ملتا ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کباب تو ہر جگہ ملتے ہیں مگر وہ 'ٹنڈے' والی بات نصیب نہیں ہوتی۔

میں نے جن ناٹکوں کا ذکر کیا تھا وہ تینوں 'مٹھی بھر کہانیاں' میں موجود ہیں اور تینوں One Act Plays ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اقبال نظر صاحب نے دلیپ کمار والا شمارہ اب تک آپ کو نہیں پہنچایا، اس لیے میں دلیپ کمار کے خاکے کو اس مراسلے کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد اپنی رائے ضرور دیجئے گا۔ ہاں ایک بات اور...... مجھے آپ کے انگریزی مضمون کا کوئی باب ابھی تک نہیں ملا!

ادب اور محبت کے ساتھ آپ کا

جاوید"

24/Nov/2022”

میرے محترم آداب!

پچھلے کچھ دن ایسی گڑبڑ میں گزرے کہ بہت سے ضروری کام ادھورے رہ گئے، ان میں آپ کے ای میل کا جواب بھی تھا۔ اس گستاخی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا ہے۔ محترم بھائی احمد شاہ اور فاطمہ بہن کا ذاتی اصرار بھی ہے۔ میں بھی ان قابل احترام ہستیوں سے ملنے کا مشتاق ہوں جو اپنی زبان کی محبت میں دنیا کے کونے کونے سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ مگر مقطع میں سخن گسترانہ بات یہ آ پڑی کہ ایک قریبی عزیز کی بیٹی کی شادی کی دعوت بھی ملی ہے۔ وہ شادی جنوری کے پہلے ہفتے میں ہونے والی ہے اور کانفرنس دسمبر کے آخری ہفتے میں منعقد ہو رہی ہے۔ اور ویزا ایک مہینے سے زیادہ کا ملے گا نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کانفرنس چھوڑوں یا شادی میں شرکت نہ کروں۔ پاکستان کا ویزا ابھی آسانی سے نہیں ملتا، کسی کی سفارش ہو جائے تو بات بن سکتی ہے۔ بہرحال یہ طے کر لیا ہے کہ کراچی درشن کرنا ضروری ہے۔ بارہ برس ہو چکے ہیں عزیزوں اور دوستوں کی صورتیں دیکھے ہوئے۔ دعا کیجیے کہ ویزا مل جائے اور میں ان لوگوں سے ملاقات کر سکوں جنھیں سیاست کے بنائے ہوئے فاصلوں نے بہت دور کر دیا ہے۔ آپ کے علاوہ، زہرا آپا، انور مقصود اور اسد محمد خاں صاحب سے ملنے کی بڑی تمنا ہے۔ دیکھیے کب پوری ہوتی ہے۔

نیازمند

جاوید“

✿✿✿

25/Nov/2022"

عزیزم!

اِسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، جو ای میل میں نے کل آپ کو بھیجا اس کے شروع میں، مَیں نے بھی لکھا کہ بہت دنوں سے آپ سے بات چیت نہیں ہوئی، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آرہے ہیں۔ کل جس آنکھ کے معالج نے میری بائیں آنکھ میں۔۔۔ (لفظ پڑھا نہ جاسکا) لگایا، مجھ سے پوچھا کہ اگر میرے علاج سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوا تو آپ نے زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میں نے کہا، یہ سوچنے کی بات ہے۔ Euthanasia زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ مجھے آپ کی اذیت کا احساس ہے۔

One Man Show اور One Woman Show لانا نہ بھولیے گا، اور بھی کوئی ایسے ڈرامے جنھیں آپ مناسب جانیں، لے آیئے گا تو نوازش ہوگی۔

پیار

ضیامحی الدین"

✿✿✿

28/Nov/2022"

محبی!

"صاحب" ملا۔ واقعی ایسی شخصیتیں کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ بڑے فن کاروں کو پانچ خامیاں معاف ہوتی ہیں، مگر یہاں تو ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس میں ایک بھی خامی نہیں۔ یہ تو پیغمبرانہ درجہ ہے، بمبئی میں اُن سے تین چار ملاقاتیں ہوئیں، ان کے اخلاق کی ایک مثال میں بھی دے سکتا ہوں۔ ایک بار انھیں کسی جلسے کی صدارت کرنے نارائن ڈھابولکر روڈ کے قریب جانا تھا، جہاں میں مقیم تھا، تو وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں ان کو بہت عزت سے ہار وار پہنائے گئے اور اسٹیج پہ بٹھایا گیا۔ مجھے کسی نے اگلی صف میں بٹھا دیا، انھوں نے کھڑے ہو کر میرا تعارف کروایا اور کسی منتظم سے کہا کہ اسٹیج پہ

ایک کرسی منگائی جائے اور مجھے اس پہ بیٹھنے کے لیے بلایا جائے۔ یہ ان کی مہمان نوازی کی انتہا تھی کیوں کہ میرا اسٹیج پہ بیٹھنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔

یوسفی صاحب کا ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔ یہ کہیں چھپا بھی تھا، یاد نہیں کہاں اور کب۔ ایک مضمون شمیم حنفی صاحب نے بھی لکھا تھا، اگر کہیں مل گیا تو بھیجوں گا۔ اپنی کوئی ایسی تحریر، جو آپ کے پڑھنے کے لائق ہو تو وہ بھی روانہ کروں گا۔

پیار
ضیا محی الدین"

✿✿✿

22/Dec/2022"

میرے محترم، بہت آداب، بہت سلام!

کافی دنوں سے آپ سے مراسلت کا سلسلہ بند ہے۔ اِس گستاخی کی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں میں پریشر بہت بڑھ گیا ہے، ہر چیز دھندلی نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں اللہ میاں میری آنکھوں کو کیوں سزا دے رہے ہیں جب کہ میں نے تو کسی حسینہ کو نظر بھر کے دیکھنے کا گناہ بھی نہیں کیا۔

بہر حال...... اب جو ہو سو ہو، کمر باندھ لی ہے اور ان شاء اللہ 25 دسمبر کو کراچی پہنچوں گا اور کوشش کروں گا کہ آپ سے جلد از جلد نیاز حاصل کر سکوں۔ قیام میرے بھائی عادل عثمان کے مکان پر ہوگا، جو گلشن اقبال میں ہے، لیکن مجھ سے رابطہ قائم کرنے کا آسان طریقہ بہن فاطمہ حسن ہیں، جو آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کی رکن ہیں اور آپ کے نیاز مندوں میں سے ہیں!

بہت ادب کے ساتھ آپ کا

جاوید"

✿✿✿

یوں حساب لگایا جائے تو ممبئی سے دبئی اور دبئی سے کراچی کا سفر پانچ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے مگر ایئرپورٹ پر تین گھنٹے پہلے پہنچنے کی شرط اور دبئی میں کراچی کی فلائٹ کا انتظار شامل کرلیا جائے تو مسافت تیرہ گھنٹہ سے زیادہ کی ہوجاتی ہے۔ تکلیف تو ہوئی مگر عزیزوں دوستوں سے ملنے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ اس کا احساس نہیں ہوا۔ جیسے ہی پہنچا تو ضیا صاحب کا پیغام رکھا ہوا تھا کہ وہ چشم براہ ہیں اور جتنی جلدی ہوسکے، ملنے کے مشتاق ہیں۔ دوسرے دن دروازہ کھلا تو بہن فاطمہ کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ 'ناپا' جانا ہے اور وہ گاڑی لے کے آئی ہیں۔

لوہے کے بند پھاٹک پر کھڑے ہوئے پہرے دار نے گاڑی کے اندر جھانکا، فاطمہ حسن نے ذرا سا جھک کر کہا، 'ضیا محی الدین' اور دروازہ اِس طرح کھل گیا جیسے ضیا صاحب کا نام نہ ہو Remote کا بٹن ہو۔ اندر پہنچے تو سامنے سرخ پتھر کی بنی ہوئی ایک خوب صورت اور پُرشکوہ عمارت کھڑی تھی جو مغل طرزِ تعمیر کا نادر نمونہ تھی۔ اُس کی اونچی محرابیں اور نازک ستونوں پر کھڑی ہوئی بُرجیاں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی فتح پور سیکری سے لاکر رکھی گئی ہیں اور ہم جیسے ہی داخل ہوں گے کسی کونے سے ایک گرج دار آواز سنائی دے گی، 'با ادب، باملاحظہ، ہوشیار!' جن صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا، انھوں نے بتایا کہ ضیا صاحب کلاس لے رہے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے دفتر میں تشریف رکھیں، وہ بس آنے ہی والے ہیں۔ کئی بڑے بڑے کمروں اور برآمدوں سے گزر کر ہم لوگ ضیا صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے، جو اِن کی شخصیت کی طرح سادہ اور دلکش تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی میز تھی، اس کے قریب ہی ایک شیلف میں کچھ کتابیں تھیں، میز کے بالکل سامنے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ ہم لوگ بیٹھ گئے اور اُن میٹھے بسکٹوں سے شغل کرنے لگے جو چائے کے ساتھ ہراول دستے کے طور پر لاکر رکھ دیے گئے تھے۔ کچھ دیر میں ضیا صاحب بھی آگئے۔ انھیں دیکھ کر خوشی تو ہوئی مگر تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ ویسے ہی ہوں گے جیسے اپنی تصویروں اور ان درجنوں Videos میں دکھائی دیتے ہیں،

جن سے یو ٹیوب بھرا پڑا ہے۔ پرانے رومن بادشاہوں جیسا تیکھا ناک نقشہ، سلیقے سے جمے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال، نہایت روشن آنکھیں اور لمبا قد، جو عمدہ تراش کے سوٹ میں کچھ زیادہ ہی لمبا معلوم ہوتا تھا، مگر وہ ضیا محی الدین، جو میرے سامنے کھڑے تھے، اتنے لمبے نہیں تھے، کندھے بھی تھوڑے سے جھک گئے تھے اور چہرے پر عمر کے نشان دکھائی دے رہے تھے، مگر ان کی آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ انھوں نے کسی بچھڑے ہوئے عزیز کی طرح گلے لگایا اور دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں پر رکھ کر اس طرح دبایا جیسے میری موجودگی کو محسوس کرنا چاہتے ہوں۔ بہن فاطمہ حسن کو تو وہ جانتے ہی تھے، میرے بھائی عادل عثمان اور میرے بیٹے سمیر سے بھی اتنی گرم جوشی سے ملے جیسے بار بار مل چکے ہوں۔ میری اور ضیا صاحب کی اگرچہ وہ پہلی ملاقات تھی مگر پچھلے کچھ مہینوں کی خط و کتابت اور فون پر ہونے والی باتوں نے ایک ایسی یگانگت پیدا کر دی تھی کہ پہلی بار آمنا سامنا ہونے پر جو جھجک اور تکلف ہوتا ہے اس کا شائبہ تک نہ تھا!

ضیا صاحب نے میری ساری کتابیں پڑھ لی تھیں اور بقول ان کے سینٹ سینٹ کر اور مزے لے لے کر پڑھی تھیں، اس لیے ان کو سارے خاکے اور تمام کہانیاں یاد تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری تحریروں میں بہت سی ایسی ہیں جن کو وہ اپنی پڑھنت میں شامل کریں گے۔ ہماری باتیں ابن انشا سے ہوتی ہوئی یوسفی صاحب تک آئیں اور پھر تھیٹر کی طرف مڑ گئیں۔ میں نے ہندوستان میں اسٹیج ڈرامے کے بارے میں بتایا۔ ضیا صاحب ہمارے ملک میں تھیٹر کی ترقی اور سرکار کی سرپرستی سے واقف تھے اور اس بات سے خوش تھے کہ ان کے اپنے ملک میں نہ سہی، پڑوس میں ڈراما زندہ ہے اور ترقی بھی کر رہا ہے۔ وہ پاکستان میں تھیٹر کی بدحالی اور عوام کی عدم دلچسپی سے بہت شاکی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس (ناپا)، جو 2005 میں قائم کیا گیا تھا، اکیلا ادارہ ہے جو ایک بڑے ملک کے لیے ناکافی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ناپا میں آنے والے طلبہ کا بڑا مسئلہ زبان ہے۔ ڈرامے کے لیے زبان کو جاننا اور الفاظ کو صحیح طریقے سے ادا کرنا بے حد ضروری ہے۔ ناپا میں

اس کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔اداکاروں کے لہجے سے مقامی بولیوں کا اثر نکالنے کی کوشش میں 'گلا بیٹھ جاتا ہے اور زبان اینٹھ جاتی ہے۔' وہ گفتگو اتنی دلچسپ تھی اور ہم دونوں اتنے محو تھے کہ ان لوگوں کو بھی بھول گئے تھے جو ہماری باتیں سن رہے تھے۔ پتا نہیں دلچسپی لے رہے تھے یا بور ہو رہے تھے۔اگر ضیا صاحب کو کلاس نہ لینی ہوتی تو گفتگو معلوم نہیں کب تک جاری رہتی۔اس ملاقات کی دو باتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ایک تو ضیا صاحب کی سگریٹ، جسے جلانے کے بعد گنتی کے تین کش لیے جاتے اور پھر ایش ٹرے کی نذر کر دیا جاتا۔ مجھے بتایا گیا کہ ضیا صاحب کی سگریٹ نوشی کا یہ انداز برسوں پرانا ہے اور وہ کبھی بھی تین کش سے زیادہ کے گنہ گار نہیں ہوتے۔ دوسری یاد ہے ان کا انداز کلام، ایک ایک لفظ درست، لہجہ شفاف اور ملائم، اگر غور سے سنیے تو ڈیش، کاما اور کولن بھی سنائی دے جائیں!

کراچی میں قیام کے دوران ضیا صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار ان کی غیر معمولی محبت کا اظہار ہوا۔ بہن فاطمہ حسن نے کراچی جم خانہ میں ایک لنچ دیا اور بہت سے دوستوں کو جمع کر لیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ضیا صاحب اس قسم کی محفلوں میں شامل نہیں ہوتے، مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سب سے پہلے پہنچنے والوں میں ضیا صاحب بھی تھے۔

کراچی کی دو شامیں بھی ہمیشہ یاد رہیں گی۔ پہلی شام وہ ہے جب ہم 'دال روٹی' کھانے ضیا صاحب کے گھر پہنچے تھے۔اُن کا گھر ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے۔مشرق اور مغرب کی تہذیب کا ملن بہت سلیقے سے کیا گیا تھا، مجھے آتش دان کے اوپر رکھے ہوئے کانچ کے اطالوی لیمپ بہت اچھے لگے، جنھوں نے لاؤنج کو روشن تو کیا ہی تھا، ایک ایسا ماحول بھی پیدا کر دیا تھا جو میرے وطن رام پور کے کسی دیوان خانے کی یاد دلاتا تھا۔ یہاں بھی وہی ہوا جو ناپا کے دفتر میں ہوا تھا، یعنی ہم دونوں صوفے پر ایک دوسرے کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئے اور اپنی باتوں میں بھول گئے کہ وہاں ڈاکٹر فاطمہ حسن بھی ہیں، میری بیوی فریدہ بھی ہیں، سمیرا اور سرمد بھی ہیں (سرمد ایک ہونہار میوزک ڈائرکٹر ہیں اور فاطمہ بہن کے بھانجے ہیں)۔ میری کوشش تھی کہ میں کم بولوں اور ضیا صاحب کو زیادہ سے زیادہ سن سکوں۔ انھوں

نے بتایا کہ پڑھنت کا آئیڈیا اُن کو لندن میں اُس وقت آیا تھا جب انھوں نے عظیم اداکار Sir John Gielgud کو شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھتے ہوئے سنا۔ جب Sir John پڑھا کرتے تھے تو بالکل ایسا لگتا تھا جیسے آپ سولہویں صدی میں پہنچ گئے ہوں اور شیکسپیئر خود بول رہے ہوں۔ ضیا صاحب نے بتایا کہ چوں کہ اردو میں پڑھنت کی روایت نہیں تھی اس لیے یہ فیصلہ کرنا کہ کیا پڑھا جائے؟ بڑا مشکل تھا، مگر کسی ادب نواز کے مشورے سے غالب کے خطوط پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا، اور پھر تو ایسے لگا جیسے ایک طلسم در بند کھل گیا ہو۔ ضیا صاحب دیر تک اپنی فلمی اور تھیٹر کی زندگی کے بارے میں بتاتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ اُن کی سوانح عمری میں اتنے اتار چڑھاؤ اور دلچسپ موڑ ہیں کہ ان پر تو خود ایک فلم بن سکتی ہے۔ وہ شام کبھی اتنی خوب صورت نہ ہوتی اگر اس میں ایک حسین اور خوش مزاج خاتون کی مہمان نوازی شامل نہ ہوتی۔ ضیا صاحب کی شریک حیات عذرا، ایک مکمل میزبان ہیں۔ ان کے دستر خوان پر 'دال اور روٹی' کے ساتھ کوئی درجن بھر ڈشز اور بھی تھیں، جن کے ذائقے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ کس کے ہاتھوں کا کمال ہیں۔ کھانے کے بعد ضیا صاحب نے ہمیں اپنی اسٹڈی کی سیر کرائی، سارا کمرہ اعزازات اور یادگار تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک دستی تحریر کی طرف توجہ دلائی جو خوب صورت فریم میں دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ وہ قرۃ العین حیدر کا خط تھا، جو انھوں نے ضیا صاحب کو لکھا تھا، 'پڑھیے پڑھیے۔' ضیا صاحب نے کہا۔ بہن فاطمہ نے بآواز بلند پڑھنا شروع کیا اور ہم سب عینی کے خط کا مزہ لینے لگے، جو انھوں نے غالب کے خطوط والے ضیا محی الدین کو غالب ہی کی زبان میں لکھا تھا۔ سب اُس شگفتہ تحریر کا مزہ لے رہے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اُس وقت میں نے ضیا صاحب کا چہرہ دیکھا تھا، وہ مسکرا رہے تھے اور چہرے پر وہی چمک تھی جو استاد سے شاباشی ملنے پر طالب علم کے چہرے پر ہوتی ہے۔ یہ خط خاصے کی چیز ہے اور کسی دوسری جگہ پڑھنے کو نہیں مل سکتا، اس لیے میں نے اسے اِس خاکے کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

آرٹس کونسل کے صدر جناب محمد احمد شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں، کمال کرتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر اور کام کرنے کا انداز دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو بچّوں کا کھیل ہے اور کوئی بھی کر سکتا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پندرہ سال سے لگاتار ہونے والی عالمی کانفرنس کے بارے میں تو دنیا جانتی ہے مگر بہت سے نہیں جانتے کہ احمد شاہ صاحب کی کوشش سے آرٹس کونسل ادبی سرگرمیوں کا ایک ایسا مرکز بن چکا ہے جس کی مثال پاکستان تو کیا دوسرے ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ ادب اور شعر کے مورچے پر ڈٹی ہوئی اِس 'One Man Army' نے اپنی خدمت اور خلوص سے کتنے دل جیتے ہیں، اس کا حساب تو میرے پاس نہیں ہے مگر اُنھوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ میری زندگی کا ایک ایسا باب ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ آرٹس کونسل کی طرف سے مجھے ایک اعزاز یہ دیا جائے گا اور یہ جلسہ 13 جنوری کو منعقد ہوگا جو میری سال گرہ کی تاریخ ہے۔ یعنی آرٹس کونسل ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان ادیب جاوید صدیقی کی سال گرہ منائے گا، جس میں شہر کے ادیبوں، شاعروں اور ادب نوازوں کو تو بلایا ہی جائے گا، میرے اُن تمام عزیزوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی جو کراچی میں رہتے ہیں۔

تو پھر یوں ہوا صاحب، کہ اس حقیر کی سال گرہ منائی گئی اور اس دھوم سے منائی گئی کہ اس سے پہلے کی ساری پارٹیاں شرما گئیں۔ کیک بھی کاٹا گیا، تحفے بھی دیے گئے اور ایک شان دار ڈنر بھی دیا گیا۔ اس یادگار جلسے میں تقریباً ساڑھے چار سو افراد شریک تھے، جن میں سے زیادہ تر ایسے تھے جنھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ محترم احمد شاہ اور بہن فاطمہ حسن نے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ محترمہ زہرا نگاہ نے ایک مضمون پڑھا اور جناب ضیا محی الدین نے میرا ایک خاکہ 'بی حضور' پڑھ کر سنایا، جس کی وہی حیثیت تھی جو زردے پر بالائی کی ہوتی ہے۔ اس شام میں نے ضیا صاحب کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس کو ملاقات اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پڑھنت ختم کر کے چلے گئے تھے اور اس طرح اچانک

چلے جانے کی وجہ کئی دن بعد ان کے ای میل سے معلوم ہوئی۔

✿✿✿

16/Jan/2023"

حضرت! مجھے اس بات کا افسوس ہے اور رنج بھی ہے کہ تیرہ جنوری کو آپ کی سال گرہ کی مبارک باد نہ دے پایا۔ دراصل آخری دو تین صفحے پڑھتے پڑھتے میرے پاؤں میں ایک سنسنی سی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی دائیں ٹخنے کے اوپر ایک ٹیس اٹھی۔ کبھی کبھی بستر سے اٹھتے وقت یہ دِقّت پیش آتی ہے، (شاید نس پہ نس چڑھ جاتی ہے) مگر آٹھ دس سیکنڈ کے بعد اپنا ڈنک مار کے دور ہو جاتی ہے۔ لیکن تیرہ جنوری والی ٹیس اُس ہچکی کی طرح تھی، جو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو 'فراغت' ہوئی، پھر سے اُبھر آئی اور شدت سے، تو میں نے سوچا، یہاں ہائے واویلا کرنے کے بجائے یہاں سے نکل چلو۔ معافی قبول کیجئے۔

ضیا محی الدین"

✿✿✿

23/Jan/2023"

عزیزم!

پچھلے ہفتے آپ کو ایک خط لکھا تھا اور اپنی مجبوری کا بیان کیا تھا، آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا، کیا میری معافی قبول نہ ہوئی؟

اگر اس خط کا بھی جواب نہ آیا تو کیا سمجھوں؟ کیا آپ تعلقات قطع کرنا چاہتے ہیں؟

منتظر

ضیا محی الدین"

25/Jan/2023"

میرے محترم!

معافی، معافی، معافی!

میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ خاکہ پڑھتے وقت آپ بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے اور آخر میں آپ کی آواز بھی بھرّا گئی تھی۔ اس کیفیت کے باعث آپ جلسہ چھوڑ کر جلدی چلے گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے پاؤں میں تکلیف ہوگئی تھی تو مزاج پُرسی کے لیے ضرور حاضر ہوتا۔ جواب میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ کراچی سے واپسی میں کچھ دن دبئی میں ٹھہرا تھا، جہاں میل دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

اب اپنی دنیا میں واپس آگیا ہوں اور کراچی والوں کی مہمان نوازیوں کو یاد کر رہا ہوں۔ آپ کی محبت ہمیشہ یاد رہے گی۔

نیازمند

جاوید"

✿✿✿

ممبئی پہنچ کر مہینے بھر سے رُکے ہوئے کاموں کو سنبھالنے میں مصروف تو تھا مگر ذہن بار بار یاد دلاتا تھا کہ ضیا صاحب کو خط لکھنا ہے کہ 13 فروری 2023 کو کراچی سے فون آیا۔

"دو دن کی علالت کے بعد ضیا محی الدین صاحب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے!"

مجھ پر جو گزری بیان نہیں کر سکتا۔ ہائے کیا شخصیت تھی، کاش وہ کچھ دن اور جیے ہوتے، کاش اُن سے کچھ اور سننے اور جاننے کو ملتا۔ ان کو یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک بے حد حسین ملاقات ادھوری رہ گئی ہے۔ پتا نہیں اُنھیں اتنی جلدی کیوں تھی؟

✿✿✿

قرۃ العین حیدر کا خط ضیا محی الدین کے نام:

''عزیز القدر، جلیل القدر اداکار ضیا محی الدین آف ریڈیو پاکستان، انگلینڈ، امریکا فیم!
واضح ہو کہ خط تمہارا پیغام مسرت لایا۔ دل کا سرور، آنکھوں کا نور حاصل ہوا، اور اِس حقیر فقیر پُر تقصیر نے عش عش ہو کر سوچا:
'یا الٰہی! یہ خواب ہے یا حقیقت؟' آہ، دیگر یہ کہ یہ ناچیز حال ہی میں بمبئی واپس آئی ہے اور اے رفیقِ دیرینہ! تمہاری زیارت کی دل میں سمائی ہے۔ اگر اس فلکِ ناہنجار کو منظور ہوا تو قوی اُمید ہے کہ فوراً ملاقات ہو گی!'

ٹک آ کے میرؔ کے کوچے کو دیکھ تو اے شیخ
ہزار خانۂ کعبہ ہیں کو بکو اے شیخ

نیز یہ معلوم کر کے از حد مسرت ہوئی کہ زوجہ تمہاری مع اطفال آنے والی ہیں۔ اس اتوار کی سہ پہر یا شام تشریف لاؤ تو بڑی مہربانی ہووے گی۔ پتا غریب خانے کا اوپر درج ہے، پیڈر روڈ ہو کے آخر تک پہنچ کر ٹیکسی والے سے کہو کہ گماڈیا روڈ میں موڑ لے۔ بعد ازاں اُس سڑک پر بائیں ہاتھ کے آخری پھاٹک میں داخل ہو جاؤ تو کیا دیکھو گے کہ دو عمارتیں کھڑی ہیں کہ نام ایک کا 'اکوامرین' ہے اور دوسری کا 'آشا محل'، رنگ اس کا گلابی ہے، وہاں اس عاجزہ کو چشم براہ پاؤ گے۔ اگر آ سکو اور مصروفیات بسلسلہ اداکاری ہوں تو دفتر میں فون کر دو، اور تھوڑا لکھے کو بہت جانو، خط کو تار سمجھو۔''

✿✿✿